رجسٹرڈ ایل نمبر ۸۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

دیں کی نصرت کے لئے اک آسماں پر شور ہے | عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا | اب گیا وقت خزاں آئے ہیں پھل لانے کے دن

ہر سوموار اور جمعرات کو قادیان سے شائع ہوتا ہے

الفضل

دنیا میں ایک نبی آیا پر دنیا نے اسکو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اسکی سچائی ظاہر کردیگا۔ (الہام حضرت مسیح موعود ؑ)

مضامین بنام ایڈیٹر

کاروباری امور کے متعلق خط و کتابت بنام مینیجر ہو

ایڈیٹر:- غلام نبی ❖ اسسٹنٹ:- مہر محمد خان

قیمت سالانہ

فہرست مضامین

نمبر ۵۹ | مورخہ ۷ فروری ۱۹۲۱ء | دو شنبہ | مطابق ۲۸ جمادی الاول ۱۳۳۹ھ | جلد ۸

مدینۃ المسیح

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بخیریت ہیں۔

۳ر فروری بعد نماز ظہر بورڈنگ مدرسہ احمدیہ میں جناب ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب نے نصاب عصبی کی بناوٹ اور اس کے کام پر مدرسہ احمدیہ کی ساتویں جماعت کے طلباء ۔ طلباء مبلغین کلاس ۔ مبلغین اور دیگر معزز احباب کے سامنے بموجودگی حضرت خلیفۃ المسیح ؑ لیکچر دیا ۔ جو نماز عصر تک جاری رہا۔

جناب میر صاحب نے نہایت آسان اور شستہ طریق سے تصاویر کے ذریعہ اعضاء انسانی کی بناوٹ اور انکی حرکت سمجھائی چونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے ۔ اسلئے یہ کئی لیکچروں میں ختم ہوگا۔

۴ر فروری کو خانصاحب غلام محمد صاحب نے اپنے مکان پر تقریباً ایک سو آدمیوں کو چائے کی دعوت دی ۔ جزاہ اللہ۔

ایک نہایت ضروری اعلان

جب کوئی شخص سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوتا ہے تو اسی لئے کہ وہ اس حق کو پا لیتا ہے ۔ جو اس زمانے میں خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے دنیا پر ظاہر کیا ہے اس حق کے مقابلے میں رسم و رواج کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں ۔ پہلی سفلی زندگی پر ایک موت طاری ہو جاتی ہے انسان اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرتا ہے ۔ اور سمجھتا ہے کہ اب میں وہ نہیں جو پہلے تھا ۔ غرض وہ خوش ہوتا ہے ۔ کہ میں نے ایک لعل بے بدل حاصل کر لیا ۔ گو دنیا اسکے اس فیصلے پر ہنستی ہے ۔ اور اسے طرح طرح سے مطعون کرتی ہے ۔ لیکن وہ دنیا کی کم مائیگی اور غفلت پر حیران ہوتا ہے کہ کیوں اس نور کو لینے کی کوشش نہیں کرتی ۔ جو آج دنیا میں نازل ہوا ہے ۔ اسلئے وہ کوشش کرتا ہے ۔ کہ ہر ایک آدمی کو اس نور سے متمتع کرے ۔ اسی کا نام تبلیغ ہے ۔ پس تبلیغ ایک ایسا کام ہے ۔ جس کے بغیر ایک مومن اپنے اخلاص اور جوش ایمان کی وجہ سے ایک لمحہ بھی گذارہ نہیں کر سکتا ۔ لیکن پچھلے سالوں میں ہماری تبلیغی رفتار بہت سست رہی ہے ۔ اسلئے پچھلے جمعہ کے خطبہ میں اور سالانہ جلسہ کے موقعہ پر بھی حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ۔ کہ اس سال اسقدر سرگرمی سے کام کیا جائے کہ تمام ہندوستان میں شور پڑ جائے اور احمدؐ کا نام اکناف ہند تک پہنچا دیا جائے ۔ کوئی بستی ایسی نہ رہے ۔ جہاں ہمارے مبلغ نہ پہنچیں ۔ کوئی فرد بشر چھوٹی قوم کا ہو یا بڑی قوم کا ہر ایک ۔ اس نور سے واقف کر دیا جائے ۔ جو اس ہمارے زمانے میں نازل ہوا۔

پس تمام احباب کو چاہیئے ۔ کہ اپنی اپنی جگہ تبلیغی جلسے کرائیں ۔ اور اپنے شہر گاؤں یا گرد و نواح کے علاقے

میں اپنے دوستوں اور دیگر لوگوں کو جمع کرکے تبلیغی لیکچر دلائیں اور وعظ کرائیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مختلف جماعتوں کے سکرٹری صاحبان دفتر تالیف و اشاعت کو یکم اپریل ۱۹۲۱ء تک مطلع فرما دیں۔ کہ وہ کب تک اپنے یہاں جلسہ کرانے کا انتظام کرسکتے ہیں۔ جب سب کی طرف سے اطلاعیں آجائینگی۔ تو ایک پروگرام بنا کر ہم اپنے مبلغین کو مختلف جگہوں پر بھیج دینگے۔ اور اس طرح سے ہم اس فرض سے جو ہم پر عائد ہوتا ہے۔ ایک حد تک سبکدوش ہوسکینگے۔ پس جماعتوں کو عموماً اور سکرٹری اور پریزیڈنٹ صاحبان کو خصوصاً جلد اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اور رئیس مقرر کرکے دفتر ہذا کو جلد اطلاع دینی چاہیئے۔

یہ کہنے سے بھی میں رک نہیں سکتا۔ کہ احباب صرف جلسوں پر ہی اکتفاء نہ کریں۔ بلکہ ہر ایک احمدی اپنے دل میں فیصلہ کرے۔ کہ اس نے جو صداقت خود حاصل کی ہے وہ دوسرے تک بھی ضرور پہنچانی ہے۔ قوم کے بچے بوڑھے اور نوجوان سب ہوشیار ہوجائیں۔ کہ یہ غفلت کا وقت نہیں جو امانت آپ لوگوں کے سپرد کی گئی ہے۔ اسکو دوسروں تک پہنچاؤ۔ اور پیشتر اسکے کہ وہ دن آئے۔ کہ تم جہان سے چل بسو۔ اپنا معاملہ خدا سے صاف کرلو۔ تاکہ تم اس کے آگے کہہ سکو۔ کہ ہم نے اپنا فرض پورا کردیا تھا۔ اور جو صداقت تونے ہم کو دی تھی۔ اس کو ہم نے نہ صرف خود قبول کیا بلکہ دوسروں تک بھی پہنچا دیا۔ اللہ تعالےٰ آپ کے ہمراہ ہو اور اپنے فرض کو پورا کرنے کی توفیق دے۔ والسلام

خاکسار۔ رحیم بخش۔ ناظر تالیف و اشاعت قادیان

اخبار احمدیہ

ایک فتویٰ اور اس کا جواب

کیا کسی شخص کی وفات پر جو سلسلہ احمدیہ میں داخل نہ ہو یہ کہنا جائز ہے۔ کہ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے اور مغفرت کرے۔

غیر احمدیوں کا کفر بینات سے ثابت ہے۔ اور کفار کیلئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کے لئے دعائے مغفرت کی خدا تعالیٰ سے اجازت چاہی۔ لیکن نہ ملی۔ پس جو مرد یا عورت کھلے طور پر سلسلہ احمدیہ میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق مغفرت کی دعا سلسلے کی توہین ہے۔ پس جس شخص نے ایسا کیا اسے اجابت سے توبہ کرنی چاہیئے۔ روشن علی۔ محمد سرور۔ قادیان

ناظر تعلیم و تربیت

چونکہ حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت میاں بشیر احمد صاحب ایم اے کو ایک سال کے لئے تفقہ فی الدین حاصل کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اسلئے ان کو نظارت تعلیم کے کام سے فارغ کردیا گیا ہے۔ اب انکی جگہ ناظر تعلیم و تربیت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب ہونگے۔ ناظر اعلیٰ قادیان

سالانہ جلسے کے انتظامی امور کے متعلق اعلان

انتظام جلسہ کے متعلق اگر کسی بھائی کو نقص معلوم ہوا ہو۔ یا اس انتظامی نقص کی وجہ سے کسی کو کچھ تکلیف پہنچی ہو۔ تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی اپنی تکالیف اور انتظامی نقص جو انہیں معلوم ہوں۔ دفتر امور عامہ میں لکھ کر بھیجدیں۔ اور ساتھ ہی ان نقائص کا تدارک جہاں تک خیال میں آیا ہو۔ وہ بھی مشورے کے طور پر لکھ بھیجیں تاکہ غور کرکے آیندہ ان نقائص کی اصلاح کی جائے۔

اس قسم کے مشورے اور نقائص جو احباب بھیجینگے وہ کانفرنس میں پیش کرکے ان کا فیصلہ کرایا جاویگا۔ انشاء اللہ اسلئے احباب کو چاہیئے کہ اس قسم کے مشورے جو بھیجنے ہوں جلد بھیجیں تا کانفرنس میں پیش کئے جائیں۔ ناظر امور عامہ

موصیوں کے متعلق اعلان

عموماً وصیت کنندگان کو یہ غلط فہمی لگی ہوئی ہے کہ وہ وصیت کرنے کے بعد اس پر عمل اس وقت سے کرتے ہیں کہ جب ان کے پاس سارٹیفکیٹ پہنچ جائے جو درست نہیں ہے۔ وصیت پر اسی تاریخ سے عمل ہونا چاہیئے۔ جس تاریخ سے کہ وصیت کی جائے۔ سارٹیفکیٹ کا انتظار کرنا سخت غلطی ہے۔ سارٹیفکیٹ کے اجراء میں دیر ہوجاتی ہے۔ اسلئے بذریعہ اعلان ہذا ان موصیان کو مطلع کیا جاتا ہے۔ کہ جنھوں نے عشر آمد داخل کرانے کی وصیت کی ہے کہ وہ تاریخ وصیت سے اپنی آمد کا عشر اگر سابق داخل نہ کرایا ہو۔ تو اب داخل کرادیویں۔ علیحدہ علیحدہ خطوط لکھنے میں بلا وجہ دقت ہوگی۔ اور صرف جو ہوگا وہ علاوہ ہوگا۔ افسر بہشتی مقبرہ۔ قادیان

ان کا مالک کون ہے؟

جلسہ میں مندرجہ ذیل گمشدہ اشیاء دفتر امور عامہ میں آئی ہیں۔ جس صاحب کی ہوں۔ دفتر امور عامہ سے طلب کرے۔

چادر کھدر مستعمل ایک۔ تولیہ مستعمل ایک۔ گلوبند اونی بزنگ خاکی مستعمل ایک۔ بچے کے پاؤں کا نقری زیور جس کا نام گھنگرو ہے۔ حمائل شریف مترجم۔ اسپر حمائل والے کا نام کریم بخش لکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں ہے۔ والسلام

ناظر امور عامہ۔ قادیان دار الامان

کم از کم پانچ پانچ شخص احمدی بناؤ

خادم نے گذشتہ دنوں میں حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت بابرکت میں ایک عریضہ لکھا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ہماری جماعت کا ہر فرد اگر کم سے کم پانچ دوستوں کو سلسلہ احمدیہ میں داخل کرنے کی کوشش کرے تو وہ جرمانہ جو کہ حضور نے عائد فرمایا ہے نہ ہے۔ خادم نے اس تحریک کے بعد دل میں سوچ لیا۔ کہ اس سال سب سے اول نمبر پر خادم اپنی کارگزاری دکھلائے۔ اللہ تعالےٰ کے محض فضل سے ایک میرے دوست جن کو میں تقریباً چھ ماہ سے برابر سمجھا تا تھا۔ سلسلہ میں آج داخل ہوئے۔ اور خدا سے امید ہے کہ حضور کی دعاؤں کے طفیل عاجز اپنی کارگذاری پھر دکھلائیگا۔ اخبار الفضل دوستوں کی ترغیب کے لئے شایع کردے۔ کیا عجیب ہے کہ ہمارے دوسرے بھائی اس سے متاثر ہوکر راہ خدا میں لگیں اور حسنات دارین حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں۔ عاجز درخواست دعا کرتا ہے۔ والسلام۔

خاکسار۔ حضور کا جان نثار خادم نور الحسن بھاگل پوری

نماز جنازہ

چودہری اللہ دتا صاحب نمبردار خانا والی ضلع سیالکوٹ کے حقیقی بھائی چودہری فتح محمد صاحب فوت ہوگئے ہیں۔ احباب جنازہ غائب پڑھکر عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام۔ خاکسار غلام احمد مولوی فاضل بدوملہوی

خاکسار کی دختر مسماۃ رمضان بی بی بعمر ۷ ماہ کل بروز ہفتہ بتاریخ ۲۹ ۱/۲ وفات پاگئی ہے۔ احباب جنازہ غائب پڑھیں۔

خاکسار محمد یامین از موضع دیوانسنگھ تحصیل کبیر والہ ضلع ملتان

ضلع ڈیرہ غازیخان میں ایک احمدیوں کا گاؤں بستی رندان ہے۔ وہاں کی مسجد احمدیہ کے امام میاں عیسیٰ خان سالانہ جلسہ سے واپس گئے ہوئے راستہ میں بیمار ہوگئے اور گھر میں آکر دو تین روز کے بعد فوت ہوگئے۔ مرحوم پرانے احمدی مخلص اور نہایت ہی نیک تھے۔ علاوہ ازیں حکیم عبدالخالق صاحب کا لکوی رسالہ کی لڑکی فوت ہوگئی ہے۔ احباب کی خدمت میں درخواست ہے کہ ہر دو کا جنازہ غائب پڑھکر ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ خاکسار محمد اکبر عفی اللہ عنہ۔ سکرٹری انجمن احمدیہ ڈیرہ غازیخان +

الفضل قادیان دارالامان ۔ ۷ر فروری سنہ ۱۹۲۱ء

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞ نحمدہ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو الناصر

کونسا مذہب دنیا کی تسلّی کا موجب ہو سکتا ہے؟

پروفیسر رام دیو صاحب کے مضمون کا جواب

(از حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہٖ)

احباب کرام کو یاد ہو گا۔ کہ پروفیسر رام دیو صاحب کے ایک لیکچر کے متعلق جو انھوں نے آریہ سماج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر دیا تھا۔ اور جس میں انھوں نے ویدک دھرم کی فضیلت دوسرے مذاہب پر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کے "الفضل" میں شایع ہو چکا ہے۔

پروفیسر صاحب کے مضمون کا خلاصہ

پروفیسر رام دیو صاحب نے اس مضمون کا جواب پرکاش کے ۱۶ر جنوری ۱۹۲۱ء کے پرچہ میں شایع کرایا ہے۔ جس میں انھوں نے اوّل تو اس بات پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے کہ ان کے مضمون پر سنجیدگی اور متانت سے نکتہ چینی کی گئی ہے۔ پھر ہندو مسلم اتحاد پر میرے خیالات کی تائید کی ہے۔ آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے غلط فہمی سے پروفیسر صاحب کی طرف یہ بات منسوب کر دی ہے کہ انھوں نے اسلام کے خلاف یہ دلیل دی ہے کہ مسلمانوں کا رنگ کالا ہے۔ اسلئے وہ یورپ کی تسلی نہیں کر سکتے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے عیسائیوں کے متعلق بطور مذاق کہی تھی۔ اور "تیج" کے نمبر میں شایع شدہ خلاصہ تقریر سے اس قسم کی غلط فہمی کا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ پھر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسٹر سید امیر علی صاحب اور مسٹر خدا بخش کی کتابوں سے اقتباسات جس غرض سے پروفیسر صاحب نے پیش کئے تھے۔ اس کا مطلب بھی میں غلط سمجھا ہوں

وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی مذہب کے پیرو کا اس مذہب سے منکر ہو جانا لازمی طور پر اس مذہب کے غلط ہونے کی دلیل نہیں۔ لیکن اگر کسی مذہب کا پرجوش واعظ اور مسلّمہ عالم اس کتاب میں جو اس نے اس مذہب کی حمایت میں لکھی ہو۔ اس کے کئی مسائل کو زمانہ کے لحاظ سے ناقابل حمایت تسلیم کرے تو یہ ان مسائل کی کمزوری کا ثبوت ضرور ہے۔ اگر ایک مقدمہ میں ایک فریق کا وکیل ہی خاص امر پر زور نہ دے یا اپنی کمزوری مان لے اور موکل اس کے نمائندہ ہونے سے انکار نہ کرے۔ تو عدالت کے لئے ناممکن ہے کہ ان امور کے متعلق اس فریق کے حق میں فیصلہ کرے۔ سید امیر علی نہ مرتد ہیں نہ معمولی مسلمان بلکہ انھوں نے یہ کتاب ہی اس غرض سے لکھی تھی۔ کہ یورپ میں اشاعت اسلام ہو۔ پس جب ایک مسلمان عالم دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کے لئے ایک کتاب لکھتا ہے اور اس میں یہ بتاتا ہے۔ کہ اس کے بعض مسائل وحشیوں کے لئے تو مناسب تھے۔ لیکن آج غیر ضروری ہیں۔ تو اگر کوئی غیر مذہب کا واعظ اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ کئی مسلمان عالم بھی اس روشنی کے زمانہ میں اسلام کے چند مسائل کی حمایت نہیں کر سکتے۔ تو اس کا کیا قصور ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔ اسکے دو جواب ہو سکتے تھے یا یہ کہ سید امیر علی مرتد ہیں یا یہ کہ حوالہ غلط ہیں۔ مگر سید صاحب کو کسی نے کافر نہیں قرار دیا۔ اور ان کے حوالوں کو کسی نے غلط ثابت نہیں کیا۔ پس ان مسائل کا اسلام کی کمزوری کی دلیل ہو

پیش کرنا بالکل درست تھا۔ یہ میری دلیل تھی بھی اور ہے بھی۔ کہ کسی مذہب کے نمائندوں کا باوجود کوشش کے اس کے بعض مسائل کی حمایت نہ کر سکنا اس مذہب کی کمزوری کی دلیل ہے۔

پھر پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ ہندو صاحبان کے جو حوالے میں نے پیش کئے تھے وہ اپنے مُدعا کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً لالہ لاجپت رائے صاحب کے اقوال اول تو کچھ ثابت ہی نہیں کرتے۔ اور اگر ثابت کریں۔ تو وہ آریہ سماجی نہیں ہیں۔ پھر اگر انھوں نے یہ کہدیا کہ پندرہ سو برس سے بعض عقائد کی وجہ سے ہندو مذہب ہماری تباہی کا موجب ہو رہا ہے۔ تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اسکے تو سب ہندو قائل ہیں۔ لالہ مولراج صاحب بھی آریہ سماج کے مذہبی نمائندہ نہیں ہیں۔ اور ان کے خیالات سے آریہ سماج کے دونوں فریق اختلاف ظاہر کر چکے ہیں۔ نہ انھوں نے آریہ سماج کی حمایت میں کبھی کوئی کتاب لکھی ہے۔ آریہ گزٹ نے اگر شودروں کے لئے ودھواہ بیاہ کی اجازت دیدی ہے۔ تو اسمیں کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ پنڈت دیانند صاحب نے بھی شودروں کے لئے ودھواہ بیاہ جائز قرار دیا ہے۔ پس آریہ سماج کا کوئی نمائندہ آریہ اصول سے منحرف نہیں ؎

پھر لکھتے ہیں کہ ہندو مذہب میں اختلاف کثیر کی موجودگی ویدک دھرم کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ ویدک دھرم ہندو دھرم نہیں۔ بلکہ ایک عالمگیر دھرم ہے۔ جو لوگ ویدوں کو نہیں مانتے۔ اور جن کو ہندوؤں نے اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کیا۔ اور جنھوں نے ویدک دھرم کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا وید کے خلاف لکھنا ویدک دھرم پر کوئی حرف نہیں لاتا ؎

آخر میں لکھتے ہیں کہ مینے جو چیلنج ان کو دیا ہے کہ سید امیر علی صاحب نے اسلام کے جن مسائل کو ترک کر دیا ہے ان کے متعلق وہ مجھ سے بحث کر سکتے ہیں۔ وہ اس چیلنج کو منظور کرتے ہیں۔ اور اگر مجھے اعتراض نہ ہو تو سب سے پہلے قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف دلائل پیش کرنے کے لئے وہ تیار ہیں وہ مضامین پہلے اخبارات میں شایع ہو جاویں پھر کتابی صورت میں شایع ہو جاویں ؎

رنگت کا سوال مذاق تھا

پروفیسر صاحب کے اس لیکچر کا خلاصہ جو انھوں نے آریہ سماج کے جلسہ پر دیا تھا۔ اخبارات میں یہ دیا گیا تھا کہ اسلام آئندہ دنیا کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک تو مسلمانوں کا رنگ سفید نہیں۔ دوسرے خود بعض مسلمان مصنف اسلام کے بعض مسائل کو غلط اور ناقابل تسلیم تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں سوالات میں سے پہلے سوال کے متعلق تو اپنے تازہ مضمون میں پروفیسر صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کہ وہ غلط فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ اسلئے اسکے متعلق مزید بحث فضول ہے۔ دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ جسے انھوں نے پھر پیش کیا ہے۔ اور اسکی صحت پر زور دیا ہے۔ پس میں اسی کے متعلق مزید روشنی ڈالوں گا۔ مگر پیشتر اسکے کہ میں ان باتوں کا جواب دوں۔ جو پروفیسر صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں بطور تشریح کے یا بطور دلیل پیش کی ہیں۔ میں یہ امر لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ یہ امر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ پروفیسر صاحب نے سوال اول کے متعلق غلط فہمی کو میری طرف کس طرح منسوب کیا ہے۔ غلط فہمی کے تو یہ معنے ہوتے ہیں۔ کہ کسی عبارت کا جو اصل مطلب ہو۔ اسکے خلاف دوسرا مطلب سمجھ لیا جائے۔ اور یہ بات اس جگہ درست نہیں۔ کیونکہ میں نے جو مفہوم "بندے ماترم" کا سمجھا ہے۔ اسکے سوا اور کوئی مطلب اس کا نکل ہی نہیں سکتا۔ پس اگر غلط فہمی تھی تو اس کا مرتکب "بندے ماترم" ہے نہ کہ میں۔ "بندے ماترم" ان کی تقریر کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھتا ہے "مگر یہی سب کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا رنگ سفید نہیں۔ اسلئے یورپ کی مشکلات کا حل ان سے نہیں ہو سکتا"

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ بات مسیحیوں کے متعلق مذاق کے طور پر کہی تھی۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اگر مسیحیوں سے مذاق کرنا تھا تو وہ اس حصۂ لیکچر میں ہونا چاہئے تھا۔ جو مسیحیوں کے متعلق تھا نہ کہ اس حصہ میں جو مسلمانوں کے متعلق تھا۔ اور پھر اگر مذاق ہی کرنا تھا۔ تو انھوں نے کیوں یہ نہ کہا کہ ویدک دھرم سے بھی اس مشکل کا حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسکے پیرووں کا رنگ سفید نہیں۔ ایک تیسری قوم کو کیوں بیچ میں لے آئے۔ مگر چونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مذاق تھا۔ اسلئے میں بھی اسکو مذاق ہی تسلیم کرتا ہوں ؎

اب رہا دوسرا سوال جو یہ ہے۔ کہ چونکہ اسلام کے بعض پیرو اسکے بعض مسائل کو ضرورت زمانہ کے مطابق نہیں بتاتے۔ یا غلط قرار دیتے ہیں۔ اس لئے اسلام اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسکے متعلق اپنے تازہ مضمون میں پروفیسر صاحب نے کچھ تشریحات کی ہیں اور کچھ شرائط لکھی ہیں۔ اور اسبات پر مصر ہیں کہ یہ دلیل میری درست تھی۔ پروفیسر صاحب کے تازہ بیان کے مطابق اگر کسی مذہب کا مصنف پیرو جو اس مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو۔ اور وہ اس مذہب کے بعض مسائل کو ناقابل حمایت ظاہر کرے۔ اور دوسرے لوگ اسکو مرتد قرار نہ دیں۔ تو اس شخص کا یہ اقرار ضرور اس مذہب کے ان مسائل کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور دو صورتوں میں سے ایک ضرور اختیار کرنی ہوگی۔ یا اس شخص کو مرتد ثابت کرنا ہوگا یا حوالہ جات کو غلط ثابت کرنا ہوگا ؎

تصنیف کسی کو راہ نما یا نمائندہ نہیں بنا دیتی

میرے نزدیک پروفیسر صاحب نے جو تشریح اپنی دلیل کی اب کی ہے۔ اس سے بھی ان کا مُدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اور جو حوالے انھوں نے دئے ہیں وہ بھی درست نہیں ہیں۔

پروفیسر صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ تصنیف کسی کو رہنما اور مسلمہ لیڈر نہیں بنا دیتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رہنما دنیا میں گذرے ہیں۔ لیکن انھوں نے خود کوئی تصنیف نہیں کی۔ اور بعض ایسے لوگوں نے جو اہل نہ تھے۔ تصانیف کر دی ہیں۔ تصنیف تو ادبی مذاق یا جوش قلب پر دلالت کرتی ہے۔ یا شہرت و نمود کی خواہش کی علامت ہے۔ پس سید امیر علی صاحب کا یا اور کسی کا کوئی کتاب لکھ دینا اسبات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ مسلمہ لیڈر تو وہ تبھی ہو سکتے ہیں۔ جب کوئی جماعت مسلمانوں کی ایسی موجود ہو جو اپنے آپ کو ان کی رائے سے متفق ظاہر کرتی ہو۔ اور ان کی اتباع کی مُدعی ہو یا کم سے کم ان کو مذہبی طور پر کوئی رتبہ دیتی ہو۔ مثلاً مذہبی مسائل میں ان کی رائے کو وقعت دیتی ہو۔ ان سے مذہبی امور میں مشورہ لیتی ہو۔ مگر یہ بات ہرگز ثابت نہیں۔ نہ سید امیر علی صاحب۔ نہ مسٹر خدا بخش صاحب نہ مسٹر مرزا الحمد صاحب۔ جن لوگوں کے اقوال یا تحریریں پروفیسر صاحب نے نقل کئے ہیں [illegible] سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ؎

جس کو تمام فرقہائے اسلام تو الگ رہے کسی ایک فرقہ نے بھی کبھی ایک مذہبی عالم واقف شریعت اور ماہر تسلیم کیا ہو۔ مثلاً سید امیر علی صاحب ہیں۔ انکی تمام تر عزت و شہرت انکی قانونی قابلیت کی وجہ سے ہے یا سیاسی سعی کی وجہ سے۔ اور اب تو مسلمان ان کو سیاسی لیڈر بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اور مسٹر خدا بخش صاحب کو کسی رنگ میں بھی مسلمانوں میں کوئی عظمت حاصل نہیں ہوئی۔ اور دوسرے صاحبان جن کے آپنے نام لکھے ہیں۔ وہ خود آپکے معیار کے مطابق بھی پورے نہیں اُترتے۔ کیونکہ انہوں نے اسلام کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی پس اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ کسی مذہب کے کسی معتبر عالم کا قول اس مذہب کے خلاف استعمال ہوسکتا ہے تو بھی ان لوگوں کے اقوال اسلام کے خلاف استعمال نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ لوگ مذہبی عالم کبھی بھی تسلیم نہیں کئے گئے۔ اور کبھی بھی مذہبی اُمور کے تصفیہ میں ان سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ اگر انمیں سے بعض نے اسلام کے متعلق کتب بھی لکھی ہیں۔ تو اس سے بھی یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ یہ اسلام کے علماء میں سے ہیں اور اس کے نمائندہ ہیں۔ نمائندہ تو دوسروں کے تسلیم کرنے سے ہوتا ہے نہ کہ کتاب لکھدینے سے۔ اگر کوئی شخص آریہ مذہب کے متعلق کوئی کتاب لکھدے۔ تو کیا وہ اس کا نمائندہ کہلانے لگ جائیگا۔ کسی قوم کا نمائندہ تو وہی ہے۔ جس کو وہ قوم خود اپنا نمائندہ مقرر کرے۔ یا تسلیم کرے۔ ان لوگوں کو کب مسلمانوں نے اپنا مذہبی نمائندہ تسلیم کیا کہ ان کا قول اسلام کے خلاف حجت ہو ؎

یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ ان صاحبان کو اسلام کی تائید میں کتب لکھنے کے لئے اہل اسلام نے نہیں کہا کہ یہ کتب اہل اسلام کی طرف سے سمجھی جاویں نہ ان کی کتب کے شائع ہونے پر ان کو اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والا قرار دیا گیا ہے پس صرف اسوجہ سے کہ کسی شخص نے اسلام کی تائید میں کتاب لکھی ہے۔ اس شخص کو اسلام کا نمائندہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور نہ اس کی کتاب کو اسلام کی صحیح ترجمانی کہا جاسکتا ہے۔ خود آریہ سماج میں بیسیوں مصنف ہیں۔ پروفیسر صاحب کبھی جائز نہیں رکھینگے کہ ان میں سے ہر ایک کو آریہ سماج کا نمائندہ قرار دیا جائے یا ان کی ذاتی رائے کو مدنظر رکھ کر آریہ سماج پر حملہ کیا جائے۔ رائے اسی شخص کی حجت ہوسکتی ہے۔ جو کسی مذہب کا بانی ہو۔ یا کسی جماعت نے خود اسکو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہو یا اسکے رائے ظاہر کرنے کے بعد سب نے اُس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہو۔

کسی بات کی تردید نہ کرنا اُسکو صحیح تسلیم کرنا نہیں ہوتا

پروفیسر صاحب کا یہ فرمانا بھی کہ لوگوں نے اسکی تردید کیوں نہ کی۔ پس تردید نہ کرنا اور اس شخص کو مرتد نہ قرار دینا اس امر کا ثبوت ہو۔ کہ اسکو صحیح تسلیم کرلیا گیا۔ درست نہیں ہر مخالف رائے کا رد کرنا ضروری نہیں ہوتا نہ ہر بات جسکو رد نہ کیا جائے۔ صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اگر ہر ایک مخالف رائے کا رد کرنا ضروری ہو تو دنیا میں اندھیر پڑجائے۔ اور اسقدر فضول تصنیف کرنی پڑے کہ جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا پروفیسر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ آریہ سماج میں ہر اس بات کا جو ان کا کوئی ممبر غلطی سے کہہ بیٹھے۔ رد کیا جاتا ہے۔ اور اخبارات کے ایک ایک مضمون کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ دنیا کا کوئی مذہب بھی نہیں کرسکتا کہ اسکے افراد میں سے ہر ایک نے جو خیالات ظاہر کئے ہوں۔ ان کا بالاستیعاب رد کیا جاتا ہے۔ بیسیوں باتیں کئی وجوہ سے ناقابل التفات خیال کی جاتی ہیں۔ اور بیسیوں تحریریں ان لوگوں کی نظر سے جو جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پوشیدہ رہتی ہیں۔ پس انکار نہ کرنے کو ان کے مسلّم ہونے کی دلیل قرار دینا بالکل غلط بات ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس دلیل کی تائید میں ایک مثال دی ہے کہ اگر کسی شخص کا وکیل عدالت میں کوئی بات بیان کرے۔ اور اس کا موکل اس کا انکار نہ کرے۔ تو عدالت کے نزدیک وہ بات موکل ہی کی طرف سے سمجھی جائیگی۔ لیکن یہ مثال غلط ہے۔ کیونکہ وکیل تو اس خاص کام کے لئے موکل مقرر کرتا ہے۔ اور خود اُسے اپنا کیس سمجھاتا ہے۔ پھر اپنی یا اپنے کسی معتبر کی موجودگی میں اس سے کام لیتا ہے۔ یہاں انمیں سے کونسی بات پائی جاتی ہے۔ اگر مسلمانان عالم نے سید امیر علی صاحب یا کسی دوسرے مصنف کو اپنی طرف سے باقاعدہ مقرر کیا ہوتا۔ تو تب بیشک بشرط علم ان پر لازم آتا۔ کہ ان کی ہر ایک بات کو جو ان کے منشاء کے خلاف ہیں رد کریں۔ لیکن جب یہ بات ہی نہیں تو پھر اس مثال سے پروفیسر صاحب کیا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

سید امیر علی صاحب کی کتاب کی تردید کیوں نہ ہوئی

پروفیسر صاحب کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ اور جس وقت یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس زمانہ میں مختلف فرقوں کے وہ لوگ جو مذہب سے واقف تھے۔ اس زبان سے ناواقف تھے۔ اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن تک پہنچی تھی۔ پس ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب یا اسی قسم کی اور کتب جو انگریزی میں لکھی گئی ہوں کا تردید نہ ہونا یا ان کے لکھنے والوں کے اسلام کے نمائندہ ہونے سے انکار نہ کیا جانا اس امر کا ثبوت نہیں قرار پاسکتا کہ ان کا مضمون درست ہے یا یہ کہ وہ شخص ان لوگوں کا نمائندہ ہے۔

پروفیسر صاحب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ مسلمان ہمیشہ سے ان عقائد کے مخالف ہیں۔ اور اس قسم کی کتب کے چھپنے کے بعد بھی مخالف رہے ہیں۔ پس جب وہ مخالف خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ تو پھر کسی اور تردید کی انکو کیا ضرورت تھی۔ ہر ایک عقلمند انسان خیال کرسکتا تھا کہ جب انمیں اسقدر اختلاف رائے ہے۔ تو ایک دوسرے کا نمائندہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ خود مصنف کتاب نے اپنے نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ تو پھر باوجود مسلمانوں میں مخالف خیال کی موجودگی کے اسکی نمائندگی کا انکار کرنا ایک حماقت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ اگر کوئی شخص ان کی نمائندگی کا انکار کرتا تو کیا سید امیر علی صاحب اس امر پر ہنستے یا نہ ہنستے۔ اور کیا جواب میں یہ نہ کہتے کہ میں نے کب تمہارا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

مسلمانوں کا نمائندہ ہونے سے سید امیر علی صاحب کا انکار

مجھے تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب سید امیر علی صاحب کو مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے رہے ہیں۔ اور سید امیر علی صاحب اپنی کتاب میں اس عہدہ سے انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ متعدد جگہ لکھتے ہیں کہ اسوقت مسلمان اسلام کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور صحیح اسلام ان میں نہیں پایا جاتا اور یہ کتاب جیسا کہ وہ خود اسکے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو بزعم خود حقیقی اسلام سمجھانے کے لئے لکھی ہے نہ کہ ان کی طرف سے نمائندہ کی حیثیت سے۔ چنانچہ وہ

لکھتے ہیں "یہ کتاب جس کو پہلی کتاب کا دوسرا ایڈیشن کہنا غلط ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہے" پھر لکھتے ہیں۔ کہ یہ کتاب انھوں نے اس اُمید سے لکھی ہے کہ "ہندوستان کے مسلمان اس بڑی یورپین طاقت کے زیر نگرانی دوبارہ عقلی اور اخلاقی زندگی حاصل کریں" یہ عجیب قسم کا وکیل ہے۔ جو اپنی تقریر کا مخاطب جج کی بجائے مؤکل کو بناتا ہے۔ سید صاحب کے یہ فقرات بتاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود تراشیدہ جج خیال کرتے ہیں۔ نہ کہ مسلمانوں کا وکیل۔

سید صاحب کی نمائندگی کا انکار کیا گیا۔

یہ بات بھی درست نہیں کہ سید صاحب کی نمائندگی سے انکار نہیں کیا گیا کیونکہ گو ان کا نام لیکر ان کو مخاطب کیا گیا ہو۔ مگر ان کے جن مضامین کی طرف پروفیسر صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ ان کا رد واقعہ نگاران اسلام کی طرف سے پچھلے تیس سال کے عرصہ میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ پس جب ان مضامین کو رد کیا جاتا رہا ہے تو یہی سید صاحب کے مذہبی نمائندہ ہونے کا رد ہے۔ ان مضامین سے ایک بھی مضمون نہیں جس کا رد نہ کیا گیا ہو۔

مگر میں پروفیسر صاحب کے اس مطالبہ کو بھی کہ خاص اس کتاب کو مدنظر رکھ کر سید صاحب کی مخالفت کی گئی ہو۔ پورا کئے بغیر آگے نہیں جانا چاہتا۔ اور سید صاحب کی اپنی شہادت اس بارہ میں پیش کرتا ہوں۔ اور یہ ان کا وہ فقرہ ہے۔ جو انکی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "وہ مخالفت جو اس کتاب کی ہوئی ہے۔ اس نے یہ فائدہ بھی دیا ہے۔ کہ وہ خیالات جو اسکے ذریعہ سے اگلی نسلوں میں پیدا کرنے مدنظر تھے ان کا اثر اور بھی بڑھ گیا ہے" اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سید صاحب کی اس کتاب پر مخالفت کی گئی تھی۔ پس پروفیسر صاحب کا یہ خیال بھی غلط گیا۔ کہ سید صاحب کی نمائندگی کا انکار کیوں نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ان کی کتاب کے شائع ہوتے ہی اسکے غلط خیالات کو رد کر دیا گیا تھا۔ پس ان کی نمائندگی کا انکار ہو چکا ہے۔ سید صاحب کے اس فقرہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب بحیثیت نمائندہ اہل اسلام نہیں لکھی تھی۔ بلکہ اپنے چند خیالات کو پھیلانے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی۔ اگر پروفیسر صاحب کہیں کہ تمام اہل اسلام نے بالاتفاق ان کے نمائندہ ہونے سے انکار نہیں کیا تو میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا لالہ مولراج صاحب کے اقوال کا رد ویدک دھرم کے ہر ایک ماننے والے نے بلا استثناء کیا ہے۔ انکار کیلئے اسی قدر کافی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے اصل عقائد کا اظہار کر دیں۔ اور ننئے خیالات سے اپنی براءت کر دیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر فرد ان کا انکار کرے۔ اور یہ بات سید امیر علی صاحب کی کتاب سپرٹ آف اسلام کے متعلق خود ان کے اپنے بیان کے مطابق ہو چکی ہے۔

پروفیسر صاحب ایک اور دھوکے میں

پروفیسر صاحب ایک اور بہت بڑے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ یہ کہ وہ ایک شخص کی غلطی سے تمام لوگوں پر حجت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ خواہ کوئی شخص کسی قوم کا نمائندہ بھی ہو اسکی بات کا اثر اس کے مخالف خیال کے لوگوں پر نہیں ہو سکتا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جو شرائط پروفیسر صاحب نے بتائی ہیں۔ وہ جمیں پائی جائیں۔ اسکی بات اسکے ہم مذہبوں پر حجت ہوتی ہے تو بھی

پروفیسر صاحب کی دلیل بالکل بے وزن ہے۔ کیونکہ اسلام کی طرف منسوب ہونے والے اسوقت بیسیوں فرقے ہیں۔ جس طرح وید کی طرف منسوب ہونیوالے بیسیوں فرقے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ایک قوم کا نمائندہ بھی ہو۔ تب بھی اس شخص کا قول زیادہ سے زیادہ اس کی قوم پر حجت ہو گا۔ نہ کہ اس مذہب کے تمام پیروان پر۔ خواہ وہ اس سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ خود پروفیسر صاحب اپنے مضمون میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ کوئی آریہ سماج کا نمائندہ آریہ سماج کے اصول سے منحرف نہیں ہے۔ اور ہندو مذہب میں اختلاف ویدک دھرم کے خلاف دلیل نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ آریہ سماج کے سوا دوسرے ہندوؤں کے اقوال کو ویدک دھرم کے خلاف حجت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ وہ لوگ بھی وید کو مانتے ہیں۔ پس اگر وید کے ماننے والے مختلف فرقوں میں سے بعض لوگوں کا یہ تسلیم کرنا کہ وید سے بڑھکر اور علوم بھی ہیں۔ جن کو انسان حاصل کر سکتا ہے۔ ویدک دھرم کے خلاف اسلئے دلیل نہیں کہ ان کا کہنے والا پروفیسر رام دیو صاحب کا ہمخیال نہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر کس سبب سے ایک ایسے شخص کا خیال جو زیادہ سے زیادہ اسلام کے کسی ایک فرقہ کا لیڈر کہلا سکتا ہے اسلام کے خلاف حجت قرار دیا جائے۔ اگر اس کا قول حجت ہو گا۔ تو پھر ویدوں کے ماننے والے فرقوں میں سے کسی ایک کے سرآوردہ شخص کا قول بھی ویدک دھرم اور ویدک دھرم کے تمام ماننے والوں کے خلاف حجت ہو گا۔ اگر پروفیسر رام دیو صاحب کے نزدیک مسٹر تلک۔ پنڈت درگا دتا جوشی اور راؤ بہادر دیو راؤ نایک صاحبان جیسے ویدک دھرم کے پیرؤوں کے اقوال جو ویدک دھرم کے بعض اصول کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف اسوجہ سے قابل سند نہیں ہیں کہ یہ لوگ آریہ سماجی نہیں تھے۔ تو میں پروفیسر صاحب سے سوال کرتا ہوں۔ کہ کیوں سید امیر علی صاحب اور مسٹر خدا بخش صاحب کے ایسے اقوال جو اسلام کے خلاف ہوں۔ اسلام کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ اسلام میں بھی ویدک دھرم کے ماننے والوں کی طرح کئی فرقے ہیں۔ کیا ہم بھی پروفیسر صاحب کی طرح نہیں کہہ سکتے۔ کہ اسلام کا کوئی شخص اسلامی اُصول سے اختلاف نہیں رکھتا۔ کیونکہ احمدیوں میں سے کوئی شخص اسلامی اُصول سے اختلاف ظاہر نہیں کرتا۔ پروفیسر صاحب کے مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آریہ سماج اور ویدک دھرم میں امتیاز نہیں کر سکے۔ اور اسی طرح اسلامی فرق اور اسلام میں امتیاز نہیں کر سکے۔

غرض اگر پروفیسر صاحب کی بیان کردہ دلیل کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی وہ اسلام کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نہ تو وہ لوگ جن کے حوالجات پروفیسر صاحب نے نقل کئے ہیں اسلام کے مذہبی نمائندہ ہیں۔ اور نہ ان کو مسلمانوں نے کبھی مذہبی علماء میں شامل کیا ہے نہ ان لوگوں نے مسلمانوں کی طرف سے مذہبی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ان کے مذہبی خیالات کو مسلمانوں نے کبھی صحیح تسلیم کیا ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ ان کے خلاف عقیدہ رکھتے رہے ہیں۔ اور انکے خیالات کی عام طور پر بھی اور انکی کتب کو مدنظر رکھ کر بھی تردید ہوتی رہی ہے پس ان لوگوں کا بیان انہی کے خلاف تو دلیل ہو سکتا ہے باقی مسلمانوں یا اسلام کے خلاف کسی صورت میں بھی حجت نہیں ہو سکتا اور اگر ان کا قول باوجود تمام مذکورہ بالا وجوہ کے اسلام کے خلاف حجت ہو سکتا ہے تو پھر بعض ہندو صاحبان کے وہ اقوال بھی جو میں نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔ ویدک دھرم کے

خلافت ضرور استعمال ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا پیش کردہ قاعدہ غلط ہے

اسوقت تک تو میں نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو اصل پروفیسر رام دیو صاحب نے قائم کیا ہے وہ درست ہے۔ تب بھی جن لوگوں کے اقوال سے پروفیسر رام دیو صاحب نے استدلال کیا ہے۔ انکے اقوال خود انہی کے قائم کردہ اصل کے مطابق اسلام کے خلاف حجت نہیں۔ مگر اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر رام دیو صاحب نے جو قاعدہ بتایا ہے وہی غلط ہے۔ اول دلیل اسکے غلط ہونے کی یہ ہے کہ یہ بات ہی ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک تعلیم کو خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی بھی مانے۔ اور پھر اسکے بعض حصوں کو کمزور بھی کہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کو مانتا ہے۔ اور پھر اس بات پر بھی ایمان لاتا ہے کہ وہ بندوں کی ہدایت کے لئے کلام بھی کرتا ہے۔ اور بعض خاص بندوں کو اپنی مرضی بتلانے کے لئے چن لیتا ہے۔ اور پھر ایک خاص تعلیم پر یقین رکھتا ہو کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اس نے خود نازل فرمائی ہے۔ اور اس زمانہ کے لئے واجب العمل ہے۔ تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے بعض حصوں کو وہ رد کرے اور کہے کہ یہ ناقابل عمل ہیں کیونکہ اسکے یہ معنے ہونگے کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کو مانتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے زیادہ جانتا ہے اور خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون سے بہتر قانون تجویز کر سکتا ہے۔ اور اس قسم کا آدمی تجویز کرنا عقل کے خلاف ہے۔ کوئی عقلمند آدمی ایسا نہیں مل سکتا جو صدق دل کے ساتھ ایسا دعویٰ کر سکے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کا ملے۔ تو وہ ضرور یا تو پاگل ہو گا یا نیم پاگل کہ وہ اپنے دعوے کے بالبداہت باطل ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکتا یا فریبی ہو گا۔ کہ ظاہر میں اپنے آپ کو ایک مذہب کا پیرو قرار دیگا۔ لیکن باطن میں اس کی بیخکنی کرنے کے درپے ہو گا۔ اور دوست بنکر اس سے دشمنی کرنا چاہیگا۔ اور ان دونوں صورتوں میں اسکے قول کو دوسروں پر حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ پاگل ہے۔ تب بھی اس کی بات کسی پر حجت نہیں۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے۔ تب بھی اس کی بات کسی کے خلاف دلیل نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ نمائندہ نہیں۔ بلکہ دشمن ہے۔ اور دشمن کا قول کبھی بھی حجت نہیں ہوا کرتا۔ پس ان شرائط کا آدمی فرض کرنا جو پروفیسر صاحب نے پیش کیا ہے۔ محال ہے اور ناممکن ہے۔ اور جب ایسا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔ تو پھر اس قسم کے آدمی کا وجود فرض کر کے اسکے قول کو حجت قرار دینا ایک غلط راہ ہے۔ کیونکہ جب بنیاد ہی مفقود ہے تو اسپر عمارت کیونکر کھڑی کی جا سکتی ہے۔

عدالتی وکیل اور مذہبی نمائندہ میں فرق

پروفیسر صاحب نے عدالتی مقدمات پر قیاس کر کے فرض کر لیا ہے۔ کہ مذاہب کی جنگ میں بھی ایسے آدمی کا وجود ممکن ہے۔ حالانکہ مقدمات میں وکیل خود فریق مقدمہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک تیسرا شخص ہوتا ہے۔ جو وکالت کسی اپنے یقین اور وثوق پر نہیں کرتا۔ بلکہ روپیہ لیکر بطور مزدور کے کام کرتا ہے اور مذاہب کے وکیل ایسے نہیں ہوتے۔ بلکہ کسی مذہب کے وکیل ہونے کے یہ معنے ہیں۔ کہ وہ سب سے زیادہ اس مذہب پر یقین رکھتا ہے۔ اگر وہ یقین رکھتا ہے۔ تو اس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بعض مسائل کو غلط قرار دیتا ہے۔ اور اگر وہ بعض مسائل کو غلط قرار دیتا ہے۔ تو پھر وہ اس مذہب کا وکیل نہیں کہلا سکتا۔ ہاں یہ بیشک ہو سکتا ہے کہ ایک مباحثہ ہو۔ اور اسمیں ایک شخص کسی مذہب کی طرف سے وکیل ہو کر پیش ہو۔ اور دوران بحث میں اسکو اپنے دعویٰ کا بطلان ثابت ہو جائے۔ اور وہ اقرار کرے کہ جس مذہب پر میں تھا وہ باطل تھا۔ مگر یہاں کسی بحث کے بعد اقرار کر لینے کا سوال نہیں۔ بلکہ یہ سوال ہے کہ ایک شخص اپنے طور پر کتاب لکھنے لگا ہے اور اسمیں لکھتا ہے۔ کہ جس مذہب پر میں ہوں۔ اسکے بعض مسائل کمزور ہیں۔ پس جب یہ شخص پہلے سے ہی اس مذہب کی کمزوری کا یقین رکھتا تھا۔ تو پھر اسکی طرف سے وکالت کرنے کے لئے کس طرح کھڑا ہو سکتا تھا۔ اور ایسے شخص کو کون عقلمند اس مذہب کا وکیل کہہ سکتا ہے۔

دوسرا فرق مقدمات کے وکلاء اور مذہبی وکلاء کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ مقدمات کے فریق انسان ہوتے ہیں۔ اور انکی نسبت امکان ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول دیں یا غلطی کر دیں اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ کچھ حصہ ان کے بیان کا غلط یا جھوٹ ہو اور کچھ حصہ درست اور سچا ہو اور یہ ممکن ہے کہ ایک وکیل پر دوران مقدمہ میں اپنے موکل کے بیان کے کسی حصہ کی کمزوری ثابت ہو۔ اور وہ اس کا اقرار کر لے۔ لیکن جس تعلیم کی بنیاد اسپر ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کے کسی حصہ کے رد کر دینے کے معنے یہ ہیں کہ وہ مذہب خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور جھوٹا ہے۔ پس جو شخص کسی مذہب کے بعض حصوں کو رد کرتا ہے وہ درحقیقت اس سارے مذہب کو رد کرتا ہے۔ اور جو شخص کسی مذہب کو جھوٹا سمجھتا ہے۔ وہ اس کی طرف سے وکیل کیونکر کہلا سکتا ہے۔ پس مقدمات پر مذہبی وکالت کا قیاس کرنا بالکل غلط اور [illegible]

مذہب کے کسی حصہ سے انکار اس مذہب سے نکلنا ہے

کسی تعلیم کے بعض حصوں کو رد اور بعض حصوں کو تسلیم اسی وقت میں کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اس کو انسانی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ فلسفیانہ خیالات کے پیرو ہوتے ہیں کہ وہ بعض [illegible] جماعت فلاسفہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن انکے بعض خیالات کے منکر ہوتے ہیں اور ان سے انپر خلاف عقل کام کرنے کا الزام نہیں آ سکتا۔ کیونکہ وہ ان خیالات کو انسانی سمجھتے ہیں اور اکثر کو مان کر کچھ حصہ کا انکار کر کے بھی اس حلقہ میں داخل رہ سکتے ہیں۔ لیکن مذہب میں یہ بات ناممکن ہے۔ مذہب کے ایک شوشہ کو بھی اگر کوئی شخص یہ کہکر رد کرتا ہے کہ یہ مذہب کا جزو نہیں۔ غلط ہے۔ وہ عقلاً اسی وقت اس مذہب سے نکل جاتا ہے اور اس مذہب کا وکیل نہیں کہلا سکتا اور عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ وہ اس مذہب کی صداقت ثابت کرنے کیلئے تصانیف کریگا۔

مذہب کو بطور تمدن ماننے والے

ہاں ایک اور صورت بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض لوگ ایک مذہب کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس تمدن کے عادی ہونے کے سبب سے جو اس مذہب کے ارد گرد جمع ہو گیا ہے یا بعض اور دنیاوی اغراض کے ماتحت ظاہر میں اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس تمدن کے عادی ہونے کے سبب سے جو اس مذہب کے پیرواں میں قائم ہو چکا ہے اس نظام کا ٹوٹنا بھی پسند نہیں کرتے اور دیکھ کر کہ اگر اس مذہب کو کوئی نقصان پہنچا تو یہ تمدن بھی ٹوٹ جائیگا جو اس کا جزو اور حصہ بن گیا ہے وہ مذہب پر حملہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اس مذہب کی حمایت بھی شروع کر دیتے ہیں

لیکن اس لئے انکی غرض مذہب کا بچانا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس تمدن کا بچانا ہوتا ہے۔ جسے اسکی اصل شکل میں یا ایک قلیل تغیر کے ساتھ وہ قائم رکھنا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کی حمایت بیشک جو بجائے اصول کے اسی سبب سے ہوتی ہے۔ انکی باتوں میں اختلاف اور کمزوری پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس مذہب کو خدا کی طرف سے یقین نہ کرکے اس کی اصلی شکل کا قیام ان کے نزدیک ضروری نہیں ہوتا۔ وہ اس کو صرف ایک نام سمجھتے ہیں۔ جس نے ایک خاص جماعت کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کرکے ان کی ہستی کو ایک خاص تمدن کے ساتھ قائم رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مسیحیوں میں ایسے لوگ کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ صاحب تصنیف بھی ہوتے ہیں اور مسیحیت پر حملہ کے وقت پادریوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں اور دوسرے مذاہب کو مٹانے میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کو مسیحیت سے کوئی پیار نہیں ہوتا نہ وہ اسکو سچا یقین کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ صدیوں کے اثر سے مسیحیوں میں ایک خاص تمدن پیدا ہو گیا ہے۔ جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ اگر مسیحیت تباہ ہوئی اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مذہب قائم ہوا۔ تو وہ اپنا تمدن ساتھ لائیگا۔ اور اس سے انکی زندگی پر بھی اثر پڑیگا یا اس سبب سے نہیں۔ بعض اور اسباب دنیاوی کے سبب سے وہ اس حلقہ کا ٹوٹنا پسند نہیں کرتے۔ پس وہ باوجود اس مذہب سے متنفر ہونے کے سوسائٹی کو بچانے کے لئے مسیحیت کی مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سبب سے نہ کہ کسی مذہبی تعصب کے سبب سے۔ ایسے لوگ ترکوں کے خلاف پادریوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان کو مسیحیت سے محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ اسلام کا جو اثر تمدن پر ان کے نزدیک پڑ سکتا ہے وہ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ پس اس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے لوگ مسلمانوں میں بھی ہیں اور ہندوؤں میں بھی ہیں۔ صرف ایک ہماری جماعت ایسی ہے کہ جس میں ایسے لوگ یا تو بالکل نہیں یا بالکل شاذ ہیں۔ اور وہ بھی ایسے نہیں کہ جو علمی یا عملی حصہ میں کوئی وقار رکھتے ہوں ٭

ایک مثال

مجھے اس قسم کی ایک مثال یاد آگئی۔ ۱۹۱۲ء میں میں مصر گیا تھا۔ راستہ میں میرے ہم سفر ہندوستانیوں میں سے ایک ہندو صاحب لاہور کے باشندہ تھے جو اب سنا ہے ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ صاحب اسوقت بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور چند ماہ کے لئے گھر آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو مسلمان طالب علم بھی تھے۔ کہ وہ بھی ہندوستان رشتہ داروں سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اور کچھ ماہ میں تعلیم سے فارغ ہونیوالے تھے۔ ہمارے جہاز میں ایک پادری صاحب بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان ہندو صاحب کی ایک دن بحث ہو گئی۔ اور ان صاحب نے خوب زور سے پادری صاحب پر یہ بات ثابت کرنی چاہی کہ ہندو مذہب ہی مکمل مذہب ہے۔ اور مسیحیت اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے ایک یا دو دن کے بعد انکی مجھ سے گفتگو ہوئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تمسخر آمیز طریق پر انکار کیا۔ میں نے ان کو وہ گفتگو یاد دلائی جو انہوں نے پادری سے کی تھی۔ تو وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ وہ تو ایک مقابلہ کی صورت تھی۔ پادری اس مذہب پر حملہ کرتا تھا۔ جس کے ماننے والے میرے آباؤ اجداد تھے۔ اور جس کی طرف میں منسوب ہوں۔ اس لئے میں اس سے بحث کرتا تھا اور ہمیشہ اس کے لئے تیار رہتا ہوں مگر اسوقت تو سچی گفتگو ہے۔ میں تو خدا (تعالیٰ) کو ہرگز نہیں مانتا۔ میرا مذہب صرف قومیت ہے

ان مذاہب نے ہماری ترقی کو روک دیا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ مسلمان صاحبان بھی اسی خیال کے آدمی تھے گو جہاز سے میرے اترنے سے پہلے پہلے میں سمجھتا ہوں اور جیسا کہ انہیں سے بعض نے ذکر بھی کیا۔ انکے خیالات میں ایک حد تک اصلاح ہو چکی تھی۔

غرض اس قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور وہ مذاہب کے مقابلہ میں حصہ بھی لیتے ہیں لیکن وہ مذہبی نمائندہ ہرگز نہیں کہلا سکتے اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ کوئی شخص صدق دل سے ایک مذہب کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مانے اور پھر اس کے بعض حصوں کو ناقابل عمل یا ناقص یا باطل سمجھے۔

صرف کسی کے کہہ دینے سے کوئی مسئلہ کمزور نہیں ہو سکتا

دوسری دلیل پروفیسر رام دیو صاحب کے بتائے ہوئے معیار کے غلط ہونے کی یہ ہے۔ کہ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ مذاہب کا نمائندہ بھی ایک ایسا شخص ہو سکتا ہے۔ جو اس کے بعض حصوں کو غلط قرار دے۔ اور عارضی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص کسی تعلیم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی مانتا ہو۔ اور پھر اسکے بعض حصوں کو غلط بھی جانتا ہو تو بھی ایسے فرضی آدمی کے بعض مسائل کو رد کر دینے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ مسائل کمزور ہیں اور بودے ہیں۔ کیونکہ دوسرے کا قول اس جگہ کسی امر کو مشتبہ کیا کرتا ہے۔ جہاں وہ چیز نظروں سے پوشیدہ ہو۔ مثلاً کچھ تاجر کسی جگہ سے مویشی لا دیں۔ اور یہ ظاہر کریں کہ مثلاً فی مویشی ان کو دو دو سو روپیہ پڑا ہے۔ لیکن انہیں سے کوئی شخص یا ان کی دوکان کا منیجر خریدار سے کہہ دے کہ اصل خرید تو سو روپیہ فی مویشی کی ہے تو گو یہ ممکن ہو کہ وہ کسی مخفی سبب سے اپنے ساتھیوں یا اپنے مالکوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جھوٹ بول رہا ہو۔ لیکن خریدار کو شک پڑ جاتا ہے کہ شاید یہ بات سچ ہی ہو۔ لیکن وہ حصہ دار یا منیجر اگر مثلاً ایک بیل کی نسبت یہ کہہ دے کہ میاں یہ بیل نہیں ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ گدھا ہے۔ تو کیا پھر بھی خریدار کو شک پڑ جائیگا۔ اور وہ کہیگا۔ کہ یہ ایک حصہ دار کی رائے ہے یا منیجر کی بتائی ہوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہوگی۔ اس شخص کا ایسی بات کہنا دو حال سے خالی نہ ہوگا یا کہنے والا پاگل ہوگا یا دوسرے کو پاگل سمجھتا ہوگا۔ پس شہادت اس امر کے متعلق ہوا کرتی ہے جو بات نظروں سے اوجھل ہو۔ نمائندہ ہو یا غیر نمائندہ۔ اسکی بات تبھی قابل سماعت ہوگی جب کسی ایسے امر کے متعلق کہی۔ جو نظروں سے اوجھل ہو۔ لیکن جو بات عقل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور دلائل کے ساتھ ثابت کی جاتی ہے۔ اسکے متعلق کہنا کہ فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ ایسی باتیں جو معقولات سے ہیں۔ اور جن کی صداقت یا بطلان دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے نہ کہ روایت سے۔ انکے متعلق تو دس کروڑ انسان بھی کہہ دیں کہ وہ غلط ہیں تو ان کے کہنے کا کچھ اثر انکی صداقت پر نہیں پڑ سکتا۔ اگر کوئی شخص ان کو غلط ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ دلائل و براہین کے ساتھ ان کو غلط ثابت کر دے۔ ایسے امور میں دوسروں کے اقوال پر اپنی دلیل کا انحصار رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے بیوہ ہو جانے پر اسلئے یقین کر لیا تھا کہ قاضی کی مہر لگا ہوا خط اسکے پاس پہنچا تھا کہ تیری بیوی بیوہ ہو گئی ہے۔ جن مسائل پر اعتراض کیا گیا ہے۔ عقلی ہیں۔ تو ان کے غلط ثابت کرنے کا یہ طریق ہے کہ دلائل کے ساتھ

انکو غلط ثابت کیا جائے۔ نہ کہ زید و بکر کے قول سے انکی خلاف حجت پکڑی جائے۔ صداقت ساری دنیا کے انکار سے صداقت ہی رہیگی۔ اور جھوٹ ساری دنیا کی تصدیق سے بھی جھوٹ ہی رہیگا۔ پس کسی بات کے جھوٹا ثابت کرنے کا ایک ہی حقیقی ذریعہ ہے کہ دلائل سے اسکے جھوٹا ہونے کو ثابت کر دیا جائے۔

پروفیسر صاحب کے پیش کردہ حوالے

تیسرا جواب پروفیسر رام دیو صاحب کے مضمون کا یہ ہے کہ انہوں نے چار مسلمانوں کے اقوال پیش کئے ہیں۔ سید امیر علی صاحب۔ خدا بخش صاحب۔ یوسف علی صاحب اور مسٹر مظہر الحق صاحب۔ یوسف علی صاحب تو کوئی ایسے غیر معروف آدمی ہیں اور ان کا فقرہ ایسا مہمل ہے کہ اس سے تو کوئی نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ مسٹر مظہر الحق صاحب نے گوشت کو غیر قدرتی غذا کہا ہے اور یہ خود ایک مبہم فقرہ ہے۔ کیونکہ انسان کی کوئی خاص غذا نہیں ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کن معنوں میں یہ فقرہ استعمال کیا تھا۔ اور اگر ان کے فقرہ کے سخت سے سخت معنے بھی کر لئے جاویں تو بھی ایک طبی مسئلہ سے زیادہ اسکو وقعت نہیں دیجا سکتی اور اسکے یہی معنے لئے جا سکتے ہیں کہ گوشت کوئی اعلیٰ درجہ کی غذا نہیں۔ اور اس سے اسلام کے زمانہ حال کے لئے ناکافی ہونے کا ہرگز ثبوت نہیں نکلتا۔

اب دو شخص باقی رہ جاتے ہیں ایک سید امیر علی صاحب اور دوسرے مسٹر خدا بخش صاحب۔ مسٹر خدا بخش صاحب کی جس کتاب میں قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈائری قرار دیا گیا ہے۔ اس کا حوالہ چونکہ پروفیسر رام دیو صاحب نے نہیں دیا۔ اسلئے میں اسکے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ہاں سید امیر علی صاحب کی کتاب سپرٹ آف اسلام کے جن تین حوالوں کو انہوں نے پیش کیا ہے ان کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ درست نہیں ہیں۔

رسول کریمؐ کے متعلق سید امیر علی صاحب نے نہیں لکھا کہ آپ نے بتوں کو مان لیا

ایک حوالہ جو سپرٹ آف اسلام کے پروفیسر رام دیو صاحب نے دیا ہے۔ یہ ہے کہ سید امیر علی صاحب نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ نے کہا کہ وہ انکے تین بتوں کو مان لیں تو وہ بھی انکے خدا کو مان لینگے۔ تو آپ نے کچھ دن کے لئے بتوں کو مان لیا۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید امیر علی صاحب پر یہ اتہام ہے۔ ان پر اور ہزار الزام لگ سکتے ہوں۔ مگر یہ الزام ان پر نہیں لگ سکتا۔ انہوں نے ہرگز اپنی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کفار کے کہنے پر بتوں کو مان لیا تھا۔ بلکہ اس مضمون پر انہوں نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہی نہیں۔ یہ واقعہ جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ سپرٹ آف اسلام کے پہلے باب میں مندرج ہے۔ سید امیر علی صاحب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے حالات بیان کرتے کرتے بیان کرتے ہیں کہ "اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بعض مسیحی سوانح نویس اور مسلمان مورخ مختلف پیرایوں میں بیان کرتے ہیں" اس کے آگے انہوں نے پہلے تو اسلامی مورخین کی روایت نقل کی ہے اور بعد میں مسیحی مورخوں کا وہ بیان نقل کیا ہے۔ جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اور جسے انہوں نے سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے۔ اپنی طرف سے سید صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں کہ "مسیحی مورخین کے نزدیک۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے دل میں اپنے قبیلہ عزیز کے ملنے کے لئے یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ کہ وہ قریش کے ساتھ جو جنگ ہو رہی تھی۔ کسی سمجھوتہ کے ذریعہ خاتمہ کر دیں" اور آگے انہوں نے مسیحی مورخین کے دونوں گروہوں کے خیالات نقل کئے ہیں۔ ان کے بھی جو متعصب ہیں اور انکے بھی جو غیر متعصب ہیں۔ جیسے لین پول وغیرہ۔ پس مسیحی مورخین کے خیالات کو سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کرنا ایک ظلم عظیم ہے اور مجھے افسوس ہے کہ ایک قابل آدمی کی زبان سے اس قسم کی غلطی کی اشاعت ہو۔ اور ایک ایسے مضمون کے بیان کرتے وقت جس میں وہ ایک اہم اور وسیع الاثر مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہو۔

فرشتوں کے متعلق حوالہ بھی غلط پیش کیا گیا

دوسرا حوالہ فرشتوں کے متعلق ہے۔ پروفیسر رام دیو صاحب فرماتے ہیں۔ کہ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ قرآن میں فرشتوں کا جو ذکر ہے۔ وہ صرف محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی۔ ورنہ فرشتہ درحقیقت کوئی چیز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس حوالہ کے بیان کرنے میں بھی پروفیسر صاحب نے غلطی کی ہے۔ اور جلد بازی سے کام لیا ہے سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب سپرٹ آف اسلام میں ہرگز نہیں لکھا کہ فرشتوں کے متعلق جو کچھ قرآن میں ہے وہ صرف محمد صاحب کا وہم تھا۔ اور نہ یہ لکھا ہے کہ فرشتہ درحقیقت کوئی چیز نہیں ہیں۔ خود پروفیسر صاحب نے جو فقرہ سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے وہی اپنی غلطی کا آپ مظہر ہے۔ پروفیسر صاحب سید امیر علی صاحب کی طرف یہ فقرہ منسوب کرتے ہیں۔ کہ فرشتہ محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی کا نتیجہ ہیں۔ اب ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ وہم اور شاعرانہ نازک خیالی دو مخالف باتیں ہیں۔ کیونکہ وہم کسی ایسی چیز کے خیال کو کہتے ہیں۔ جس کا وجود نہ پایا جائے۔ لیکن کوئی شخص غلطی سے اس کے وجود کا قائل ہو۔ اور شاعرانہ نازک خیالی اُسے کہتے ہیں کہ ایک چیز تو موجود ہو۔ لیکن اس کا ذکر استعارہ اور مجاز میں نظم یا کلام کو خوبصورت بنانے کے لئے کر دیا جائے۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی متضاد ہیں۔ کہ جس چیز کو ہم وہم کہیں اُسے شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہہ سکتے۔ اور جس کو شاعرانہ نازک خیالی کہیں۔ اُسے وہم نہیں کہہ سکتے۔ وہم یہ ہے کہ ایک چیز موجود نہیں۔ اور ہم اس کو موجود خیال کرتے ہیں۔ اور شاعرانہ نازک خیالی یہ ہے کہ ہمیں علم تو ہے۔ کہ فلاں بات کس طرح ہے۔ لیکن کلام کو موثر بنانے کے لئے ہم ایک خاص رنگ میں اُسے بیان کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ جیسے ایک شخص چھلاوہ کے وجود کا قائل ہو۔ جسکی نسبت بیان کرتے ہیں۔ کہ کبھی آدمی بن جاتا ہے کبھی گھوڑا۔ کبھی بکرا۔ کبھی بیل۔ کبھی کوئی بے جان شے۔ غرض منٹ منٹ میں وہ کئی شکلیں بدل لیتا ہے۔ اس شخص کے اس خیال کو تو ہم وہم کہیں گے کیونکہ جو شے واقعہ میں موجود نہیں ہے۔ اُسے بلا کسی ثبوت کے یہ خیال کر لیتا ہے کہ فلاں طرح ہے۔ لیکن ایک شاعر جب شمع کی نسبت بیان کرتا ہے کہ وہ ساری رات روتی رہی تو اُسے ہرگز وہم نہیں کہینگے۔ کیونکہ شاعر یہ یقین نہیں رکھتا۔ کہ شمع واقعہ میں روتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے قلب کے نقشہ کو اس رنگ میں بیان کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ میرا عشق اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ ہر ایک شے جو گھل رہی ہو مجھے یونہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا میری طرح محبوب کے عشق میں رو رہی ہے اور گھلی جا رہی ہے۔ اگر کوئی

شخص واقعہ میں یہ سمجھ لے کہ شمع روتی ہی ہے تو پھر یہ شاعرانہ نازک خیالی نہ رہیگی ۔ بلکہ وہم ہو جائیگا ۔

پس شاعرانہ نازک خیالی اور وہم دو مخالف چیزیں ہیں ۔ اور ایک شخص کا وہم اس شخص کی شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہلا سکتا ۔ یا کسی کی نازک خیالی وہم کہلا سکتی ہے ۔ پس پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ فقرہ کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک فرشتوں کا وجود محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی ہے ۔ اپنی آپ ہی تردید کر دیتا ہے ۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے ۔ سید صاحب نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ فرشتوں کا ذکر جو قرآن میں آتا ہے ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وہم تھا ۔ انھوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ بدر کی جنگ میں فرشتوں کے اترنے کا جو واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے ۔ اسکی عبارت شاعرانہ رنگ کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " قرآن کریم کے وہ چند سادہ بیان جو اس شاعرانہ رنگینی کو ظاہر کرتے ہیں ۔ جو فرشتوں کے خدا کی طرف سے لڑنے کے خیال میں پوشیدہ ہے ۔ اپنی شان اور دل آویزی میں زبور کے فصیح ترین حصوں سے بھی کم نہیں ہیں ۔ یقیناً ان دونوں بیانوں میں شاعرانہ رنگ نظر آتا ہے " ان فقرات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے ۔ کہ مسٹر سید امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کے متعلق نہیں بلکہ ان کے لڑائی میں شامل ہونے کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں شاعرانہ رنگینی پائی جاتی ہے ۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے ۔ کہ وہ فرشتوں کے وجود کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وہم نہیں بتلاتے ۔ بلکہ فرشتوں کے لڑائی میں شامل ہونے کے ذکر کو شاعرانہ رنگ کا کلام ظاہر کرتے ہیں ۔ جسکے دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کے لڑائی میں شامل ہونے کے منکر نہیں بلکہ اس عبارت کی رنگینی اور فصاحت کا اظہار کرتے ہیں ۔ اور زبور جیسے صحیفوں کو نازل کرنے والوں کا مقابلہ کر کے اس کی خوبی مسیحیوں پر ظاہر کرتے ہیں ۔ اور یہ بھی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ فرشتوں کے لڑنے سے قرآن کریم کی مراد واقعہ میں لڑنا نہیں ہے ۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی نصرت کو اس شاعرانہ کلام کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے ۔ اور مجاز اور استعارہ کو استعمال کیا گیا ہے ۔ اور کیا پروفیسر صاحب اس امر کے قائل نہیں کہ خود ان کی اپنی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے ۔ اور کیا کوئی شخص اگر اہل ہنود کے اس کلام کے کہ ان کی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ کا جو حسن کلام کا اعلیٰ صفت ہے استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ معنے کرے کہ اہل ہنود کے نزدیک انکی مذہبی کتب میں بہت سی وہمی باتیں بیان ہو گئی ہیں تو اہل ہنود اس کی عقل پر ہنسینگے یا نہیں ۔ اسی طرح اہل انش پروفیسر صاحب کے اس بیان پر کہ مسٹر امیر علی صاحب کے نزدیک قرآن کریم میں جو فرشتوں کا ذکر آیا ہے وہ محمد صاحب کا وہم ہے ۔ زیر لب تبسم کریں ۔ اور پروفیسر صاحب کی اس جلد بازی پر حیران ہیں جس سے انہوں نے اس حوالہ کے درج کرنے میں کام لیا ہے ۔

اگر پروفیسر صاحب اس فقرہ کے ساتھ کے اگلے فقرات پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مسٹر امیر علی صاحب صرف یہ کہ فرشتوں کے ذکر کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وہم اور خیال نہیں بتلاتے ۔ بلکہ ان کو اس امر میں بھی شک ہے کہ فرشتوں کا ذکر مجازی ہے یا واقعہ میں بھی کوئی ایسا وجود ہے ۔ غرض وہ فرشتوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وہم نہیں بتلاتے ۔

بلکہ انکے متعلق جو امور زمانہ کے خیالات ہیں ۔ ان کے غیر یقینی ہونے کا خیال ظاہر کرتے ہیں ۔ وہ اس فقرہ کے معاً بعد جس سے پروفیسر صاحب نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ تحریر کرتے ہیں ۔ " غالباً محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مسیح اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کی طرح ایسی درمیانی ارواح کے جو خدا اور بندہ کے درمیان پیغام رسانی ہوں قائل تھے ۔ اس زمانہ میں فرشتوں کا جو انکار کیا جاتا ہے وہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ کسی وجہ سے ہمارے آباء کے جو خیالات فرشتوں کے متعلق تھے ۔ انکی ہنسی اڑائی جائے ۔ ہمارا انکار اسی طرح وہم کہلا سکتا ہے جس طرح ان کا یقین ۔ فرق صرف یہ ہے ایک میں نفی کا پہلو ہے تو دوسرے میں اثبات کا ۔ جس چیز کو ہم اس زمانہ میں اصول طبعی خیال کرتے ہیں وہ ان کو فرشتہ اور آسمانی کارپرداز ان خیال کرتے تھے ۔ آیا جس طرح ناک کا خیال ہے خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور وجود بھی ہیں ۔ جس طرح انسان اور ادنیٰ حیوانات کے درمیان اور وجود ہیں ؟ یہ ایک ایسا باریک سوال ہے ۔ کہ انسانی عقل اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی " ۔

ان فقرات سے صاف ثابت ہے کہ مسٹر امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کو محض استعارہ قرار دینے کو بھی جائز نہیں سمجھتے اور ان کا خیال ہے کہ فرشتوں کا انکار کرنے والے اگر فرشتوں کے وجود کو ماننے کا نام وہم رکھتے ہیں تو ان کے فرشتوں کو نہ ماننے کا نام بھی وہم رکھا جا سکتا ہے اور یہ کہ فرشتوں کے وجود کا مسئلہ ایسا باریک مسئلہ ہے کہ انسانی عقل اسکی تہ تک نہیں پہنچ سکتی جسکے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ ان کے متعلق ہم بحث نہیں کر سکتے ۔ ان کے متعلق بحث کرنا آسمانی کتب کا کام ہے ۔ پس باوجود مسٹر امیر علی صاحب کے ایسے صریح بیان کے پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ بیان فرمانا کہ مسٹر امیر علی صاحب قرآن میں جو فرشتوں کا ذکر ہے اسے محمد صاحب کا وہم قرار دیتے ہیں ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے ۔

سید امیر علی صاحب اور کثرت ازدواج ۔

تیسری بات جو پروفیسر رام دیو صاحب نے سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کی ہے یہ ہے ۔ کہ کثرت ازدواج زناکاری ہے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے ۔ کہ یہ تو الزام بھی ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ پہلے دو حوالہ ۔ سید امیر علی صاحب نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ کثرت ازدواج زناکاری ہے ۔ اور یہ کہ اس امر کے متعلق اسلام کی تعلیم ناقص ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سید امیر علی صاحب کی کتاب میں بعض ایسے فقرات ملتے ہیں ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کثرت ازدواج مہذب ممالک کے لوگوں کے لئے درست نہیں ۔ اور قابل ملامت فعل ہے ۔ مگر انکی کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ ہی یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے ۔ پس انھوں نے جو کچھ بھی کثرت ازدواج کے خلاف لکھا ہے وہ گو غلط ہو مگر اسلام پر حملہ نہیں کہلا سکتا ۔ کیونکہ وہ اسے اسلام کا ہی حصہ قرار دیتے ہیں ۔ سید امیر علی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نزدیک تعدد کے متعلق اسلام کی دو تعلیمیں ہیں ایک تعلیم تو غیر تعلیم یافتہ زمانوں اور ملکوں کے لئے یا بعض مجبوریوں کو جو انسان کو پیش آ جاتی ہیں ۔ مد نظر رکھ کر دی گئی ہے اور ایک تعلیم تہذیب کے زمانہ کے لئے اور مہذب ممالک کے لئے ہے ۔ چنانچہ انھوں نے اس باب کو جس میں عورتوں کے متعلق اسلام کی تعلیم بیان کی ہے ۔ شروع ہی اس فقرہ سے کیا ہے " تمدنی ترقی کے بعض مراحل

میں ایک مرد کا بہت سی عورتوں سے تعلق ایک ایسا فعل ہے جس سے بچا نہیں جا سکتا۔" اسی باب میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یہ اس امر کو ہمیشہ زیر نظر رکھنا چاہیئے کہ کثرت ازدواج حالات پر منحصر ہے بعض زمانوں اور سوسائٹی کی بعض حالتوں میں عورتوں کو فاقہ کشی اور تباہی سے بچانے کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے۔" پھر وہ لکھتے ہیں کہ "جس جگہ ایسے ذرائع جن سے عورتیں اپنا گذارہ آپ کر سکتی ہیں مفقود ہوں۔ وہاں کثرت ازدواج ضرور قائم رہیگی۔" ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید امیر علی صاحب اگر ایک طرف بعض ممالک اور بعض زمانوں کے لئے کثرت ازدواج کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف بعض ممالک اور بعض حالات میں اسکو ضروری بھی قرار دیتے ہیں۔ پس ایسی صورت میں یہ کہنا کہ وہ کثرت ازدواج کو زناکاری قرار دیتے ہیں ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ گو سید امیر علی صاحب نے کثرت ازدواج کو بعض حالتوں میں جائز رکھا ہو۔ مگر جبکہ ان کے نزدیک بعض حالتوں میں یہ تعلیم ناپسند بھی ہے تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے نزدیک اسلام کی تعلیم ناقص ہے۔ کیونکہ وہ صرف بعض زمانوں کے لئے اور بعض ممالک کے لئے محدود ہو گئی۔ یہ سوال سید امیر علی صاحب پر ضرور پڑ جاتا اگر یہ ثابت ہو سکتا کہ ان کے نزدیک اسلام کا صرف یہی حکم ہے کہ کثرت ازدواج ضرور کیا کرو یا یہ کہ انکے نزدیک اسلام کے رو سے ہر حالت میں ایک سے زیادہ بیویاں کرنی ہی پسندیدہ ہوں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ نہیں۔ وہ اگر مہذب ممالک میں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے کا حکم دیتے ہیں تو اس کا یہ باعث نہیں کہ وہ اس تعلیم کو اپنی عقل کے رو سے درست سمجھتے ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم میں نقص نکالتے ہیں بلکہ اس کا باعث جیسا کہ خود انکی تحریر سے ظاہر ہے یہ ہے کہ انکے نزدیک اسلام ہی یہ تعلیم دیتا ہے کہ کثرت ازدواج کا حکم دیتی ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم ہر حالت اور ہر زمانہ کے مطابق ہے۔ اور اسی کی تائید میں وہ ایک کثرت ازدواج کا مسئلہ بھی پیش کرتے ہیں جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے ہر زمانہ اور ہر قوم کے مناسب حال تعلیم دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ احکام کی وسعت ان کے مفید اور نفع رسان ہونے کا بہترین ثبوت ہوتی ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے احکام کی خصوصیت ہے۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی کے مناسب حال حکم بھی دیتا ہے۔ اور ادنیٰ سے ادنیٰ قوم کے مناسب حال حکم بھی دیتا ہے۔" چنانچہ وہ ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو قرآن کریم سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "چونکہ احساسات کے معاملہ میں کامل عدل ناممکن ہے اسلئے قرآن کریم کا فتویٰ کثرت ازدواج کے متعلق قریباً حرمت کا ہی حکم رکھتا ہے۔" ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اگر ایک بیوی پر اکتفا کرنا بعض حالتوں میں ضروری ہے تو اسے بھی وہ قرآن کریم کا ہی حکم ثابت کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا خیال کی تائید میں ان کے یہ حوالجات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ کثرت ازدواج کی رسم کے قانوناً رد کئے جانے کی خواہش کرتے ہوئے لکھتے ہیں "لیکن یہ منسوخی صرف حقیقت پر آگاہ ہونے اور رسول کریم کی تعلیم کے صحیح معنے سمجھنے کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔" اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ۔ "اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ایک عام مجلس علماء اسلام کی فیصلہ کر دیگی کہ غلامی کی طرح کثرت ازدواج بھی اسلامی قوانین کے خلاف ہو۔" ان حوالجات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید امیر علی صاحب۔ (۱) کثرت ازدواج کو بلا شرط برا نہیں کہتے۔ بلکہ بعض حالتوں میں اسکو ضروری قرار دیتے ہیں (۲) اگر وہ ایک بیوی پر اکتفا کرنیکو مہذب سوسائٹی میں ضروری سمجھتے ہیں اور کثرت ازدواج سے اس حکم کو اچھا سمجھتے ہیں تو اس سے اسلام کی کسی تعلیم کو ناقص نہیں قرار دیتے۔ بلکہ انکے نزدیک یہ بھی اسلام ہی کی تعلیم ہے کہ کثرت ازدواج اصل میں بری ہے فقط خاص حالات میں جائز ہے۔ پس ان حوالجات کی موجودگی میں پروفیسر صاحب کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک اسلام کی تعلیم کے خلاف کثرت ازدواج زناکاری ہے۔ وہ نہ تو کثرت ازدواج کو ہر حالت میں برا کہتے ہیں اور نہ ایک بیوی پر اکتفا کرنیکو قرآن کریم کی تعلیم سے جدا ہو کر مستحسن قرار دیتے ہیں۔ انکی تحریر کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ناقص ہے۔ اور ہر زمانہ کے لئے نہیں بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے ہر زمانہ کے مطابق حال تعلیم دی ہے۔ اور یہ دونوں مضمون ایک دوسرے کے ایسے ہی مخالف ہیں۔ جیسا کہ نور اور ظلمت۔ پھر معلوم نہیں کہ پروفیسر صاحب نے دونوں باتوں کو ایک کیونکر سمجھ لیا۔

تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب کو سید امیر علی صاحب کی اس تحریر میں کہ اسلام نے مختلف حالات کے مناسب مختلف احکام دئے ہیں۔ یہ بات تو نظر آگئی کہ وہ اسلام کے بعض احکام کو ناقص سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کا خیال ادھر نہیں گیا کہ انہوں نے خود ایسی ہی بات آریہ سماج کی نسبت اپنے مضمون میں لکھی ہے وہ لکھتے ہیں۔ کہ آریہ گزٹ نے اگر یہ لکھ دیا کہ گرے ہوئے لوگ دوہواہ بیاہ کر سکتے ہیں تو اس سے آریہ سماج کے کسی عقیدہ کی کمزوری ظاہر نہیں ہوتی بھگوان دیانند نے بھی شودروں کے لئے دوہواہ دواہ جائز قرار دیا ہے۔ اب وہ بتائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اگر پنڈت دیانند صاحب لکھ دیں کہ دوہواہ دواہ بعض قوموں کے لئے جائز ہے۔ اور بعض کیلئے نہیں۔ تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنڈت دیانند صاحب کے نزدیک وید کی تعلیم میں نقص ہے لیکن اگر سید امیر علی صاحب یہ تحریر کریں کہ اسلام نے مختلف حالات کے مناسب حال تعلیم دیکر اپنی تعلیم کو ہر حالت اور ہر زمانہ کے لئے مکمل کر دیا ہے۔ تب سید امیر علی صاحب کی یہ تحریر انکی اسلام پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے اور اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ اسلام کے بعض احکام کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

ناواقف کون ہے؟

اب میں پروفیسر صاحب کے اصل مضمون کا جواب دے چکا ہوں۔ لیکن پیشتر اسکے کہ میں اپنے مضمون کو ختم کروں۔ پروفیسر صاحب کے ایک اور اعتراض کا بھی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے لالہ لاجپت رائے صاحب کے اس قول سے کہ بعض ہندو اصول پندرہ سو برس سے ہندوؤں کی تباہی کا موجب ہیں جو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہندو مذہب کے اصولوں سے انکو مخالفت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مجھے ہندو مذہب سے ناواقفیت ہے کیونکہ لالہ لاجپت رائے ہی نہیں تمام آریہ سماج اس امر کا قائل ہے کہ ہندو مذہب کی موجودہ حالت قابل تسلی نہیں۔ پروفیسر رام دیو صاحب کے اس اعتراض کے متعلق میرے لئے اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ میری تحریر سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مجھے ہندو مذہب سے واقفیت نہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کی تحریر سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ پروفیسر صاحب کو اس تحریر سے بھی ناواقفیت ہے جس کا وہ جواب لکھنے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ نہ لالہ لاجپت رائے صاحب کا وہ قول ہے جو پروفیسر صاحب بیان کرتے ہیں اور نہ میرا وہ استدلال ہے جس پر پروفیسر صاحب اعتراض کرتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے صاحب کا یہ قول نہیں کہ ہندو مذہب کے بعض خیال پندرہ سو سال سے ہماری تباہی کا موجب ہو رہے ہیں۔ بلکہ یہ قول ہے۔ کہ خواہ پرانے زمانہ کی نسبت یہ اعتراض درست نہ ہو کہ ہندوستانی قدرت کی طاقتوں سے مرعوب ہیں مگر پندرہ سو سال سے تو ضرور یہ خیال ہماری تباہی کا موجب ہو رہا ہے اور میرا یہ

استدلال نہ تھا کہ لالہ لاجپت رائے صاحب ہندوؤں کی موجودہ حالت کو ناقابل تسلی سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ تھا کہ وہ موجودہ حالت ہی کو ناقابل تسلی نہیں سمجھتے۔ بلکہ پچھلی حالت کی نسبت بھی ان کو شک ہے۔

لالہ لاجپت رائے صاحب نے اس فقرہ میں خواہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور خواہ کا لفظ ہمیشہ دو ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب دشمن مخالف ہو۔ اور اس کے قول کی تردید کرنی ہو تو اس جگہ اسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس بحث کو میں ابھی چھیڑنا نہیں چاہتا اور جب اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے یہ لفظ استعمال کیا جائے اور کسی قول کی تردید نہیں۔ بلکہ تصدیق مراد ہو۔ تو اس جگہ اس لفظ کے معنے شک کے ہوتے ہیں۔ اور لالہ لاجپت رائے صاحب نے اس فقرہ میں پچھلی صورت میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ جسکے معنے یہ ہیں کہ انکے نزدیک یہ بات ثابت شدہ نہیں ہے کہ کبھی پچھلے زمانہ میں ہندو لوگ قوانین قدرت کے استعمال کرنیوالے اور سائنس کے موجد تھے۔ اور یہ کہ وید تمام علوم کا سرچشمہ ہیں ؛

قرآن کریم پر اعتراض کرنے کی اجازت اور بعض ضروری امور

پروفیسر رام دیو صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اسبات کی بھی اجازت چاہی ہے کہ وہ قرآن کریم کے الہامی ہونے کے متعلق کچھ اعتراضات شایع کریں۔ جن کا جواب میں شایع کروں پھر وہ مضامین کتابی صورت میں شایع کرائے جاویں۔ مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے کہ پروفیسر صاحب نے میری تحریر کے مطابق اس طریق کو اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے اور سچی بات یہی ہے کہ کسی مسئلہ کی تحقیق اسی طریق پر ہو سکتی ہے کہ اس کے صدق و کذب کو مشاہدہ یا دلائل کے ذریعہ سے دیکھا جائے نہ اس طرح کہ زید و بکر کے اقوال کو سند لیا جائے۔ زید و بکر کے اقوال سند نہیں ہوتے۔ ہاں کبھی بطور تائیدی دلائل کے استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن پیشتر اسکے کہ وہ اس کام کو شروع کریں بعض امور کا تصفیہ ضروری ہے۔ تاکہ بات شروع ہو کر ضائع نہ ہو جائے۔ اور وہ امور سوال و جواب اور انکی اشاعت کے طریق کے متعلق ہیں۔ میں اسجگہ اپنی رائے ظاہر کر دیتا ہوں۔ اگر ان میں کوئی ایسی بات ہو جو ناواجب ہو یا مثلاً ایک فریق کو اس سے کوئی خاص فائدہ پہنچتا ہو تو وہ انکی نسبت تحریر فرما دیں۔ انکی اصلاح ہو سکتی ہے۔ میری رائے یہ ہے ؛

۱۔ چونکہ اعتراضات کا سلسلہ ایسا وسیع ہوتا ہے کہ ان کا ختم ہونا ہی ناممکن ہے۔ کیونکہ اعتراض ہر ایک شے پر ہو سکتا ہے۔ اسلئے اس سلسلہ کو ناواجب طوالت سے بچانے کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے کہ پروفیسر صاحب قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف جو اعتراض رکھتے ہوں۔ انمیں سے تین اعتراض جو انکے نزدیک سب سے مضبوط اور لاینحل ہوں۔ چن لیں اور انہی کو پیش کریں۔ یہ نہیں کہ سوال کے بعد سوال کا سلسلہ شروع ہو جائے ؛

۲۔ بعض سوال بھی وسیع ہوتے ہیں۔ اور انکی جزئیات سینکڑوں ہوتی ہیں۔ اسکے متعلق بھی یہ قاعدہ رہنا چاہیئے۔ کہ جزئیات بھی تین سے زیادہ نہ چنی جاویں۔ مثلاً یہ کہ قرآن کریم پر یہ اعتراض ہو کہ اسمیں بعض باتیں خلاف قانون قدرت کے ہیں۔ تو اس اعتراض کی مثالیں انتخاب کرتے وقت بھی یہ بات مدنظر رکھی جاوے کہ سب سے صاف اور واضح تین مثالیں چن لی جائیں تا کہ ایک کے ختم ہونیوالا سلسلہ اعتراضات کا شروع ہو جائے۔ کیونکہ جب سب سے زیادہ واضح اعتراضات کا جواب ہو گیا۔ تو دوسری مثالوں کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ موجود ہی ہوگا۔ اور یہ طریق وقت سے بچانے کے لئے ایسے سلسلہ تحریرات میں مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جسمیں ایک فریق کا کام صرف اعتراض کرنا اور دوسرے کا کام صرف جواب دینا ہو ؛

۳۔ اگر یہ طریق آپ کو منظور نہ ہو۔ تو پھر یوں کیا جائے۔ کہ ایک ہی وقت میں کسی طرف سے وید کے الہامی ہونے پر اعتراضات ہوں۔ اور آپ کی طرف سے قرآن کریم کے الہامی ہونے پر تاکہ ہر ایک فریق پر برابر کی ذمہ واری ہے ؛

۴۔ سوال و جواب کا طریق یہ ہو کہ معترض اپنا اعتراض مع وضاحت اور تشریح کے شائع کر دے پھر مجیب اس کا جواب شایع کرا دے پھر معترض اس جواب پر اپنی جرح شائع کرا دے۔ اس کے بعد مجیب اس جرح کا جواب شایع کر دے۔ اور اس مسئلہ کو ختم سمجھا جائے ؛

۵۔ تین اعتراضات جو کئے جائیں۔ انکی نسبت فیصلہ کر لیا جائے کہ آیا ایک ہی دفعہ پیش کئے جاوینگے یا علیحدہ علیحدہ۔ میرے نزدیک یہ بہتر ہو گا کہ پیش اکٹھے کئے جاویں۔ آگے جواب انکے باری باری دئے جاویں۔ پہلے ایک کا جواب اور اس پر تنقید۔ اور پھر اس کا جواب شایع ہو جائے پھر دوسرے کو لیا جائے پھر تیسرے کو ؛

۶۔ یہ انتظام کیا جائے کہ دونوں فریق کے مضامین ایک آریہ اخبار میں شائع ہوں اور ایک مسلمان اخبار میں اپنی طرف سے میں "الفضل" پیش کرتا ہوں۔ "الفضل" میری مضامین کے علاوہ پروفیسر صاحب کے ان مضامین کو جو اس سلسلہ میں نکلیں گے۔ مکمل طور پر شایع کر دیا کرے گا۔ اور پروفیسر صاحب کسی آریہ اخبار میں اپنے مضامین شائع کرائیں۔ اسکے ساتھ یہ انتظام بھی کر دیں کہ وہ میرے مضامین کو بھی جو اس سلسلہ میں نکلیں بتمام شایع کر دیا کرے۔ اگر اخبارات کو اس خیال سے کہ انکے صفحات میں اس سلسلہ مضامین کے شایع ہونے کی گنجایش نہ ہوگی اس پر اعتراض ہو تو پھر یہ انتظام کیا جائے کہ ایک ضمیمہ طبع کر کے اخبار میں شایع کرایا جائے۔ آپکے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شایع ہوں۔ اور میرے بھی ضمیمہ کا خرچ فریقین ادا کریں یا کوئی ایسی جماعت جسے اس مذہبی تحقیق سے دلچسپی ہو ؛

۷۔ اگر کتابی صورت میں مضامین شائع کئے جاویں تو کسی کو اختیار نہ ہو گا کہ مضامین کے متعلق اپنی طرف سے کچھ لکھے یا مضامین میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے۔ اس صورت میں بھی بہتر ہو گا کہ دونوں فریق کے متحدہ انتظام کے ماتحت مضامین شائع کئے جاویں اور دونوں فریق خرچ میں برابر کے حصہ دار ہوں۔ اور بعد میں کتب کو تقسیم کر لیا جائے ؛

۸۔ مضامین کی تحقیق کا یہ طریق ہو گا کہ کسی کلام کے معنے کرتے وقت یا خود اسی کلام کا سیاق و سباق حجت ہو گا یا اس کتاب کا محاورہ یا لغت یا قواعد صرف و نحو اور معانی یا اس زبان یا ایسے علوم جو تمام دنیا میں تسلیم ہوتے ہیں۔ مثلاً تاریخ و جغرافیہ ہندسہ وغیرہ۔ اور ان علوم کی بات اسی طریق پر قابل سند ہو گی جس طریق پر کہ علوم عقلیہ کی باتیں سند ہوتی ہیں ؛

۹۔ کسی مضمون کا جواب تین ماہ سے زائد دیر کر کے نہ شایع ہو اگر اس سے زائد دیر لگے تو وہ سلسلہ ختم سمجھا جائیگا میرے نزدیک تو یہ امور ایسے بدیہی اور ظاہر ہیں کہ ان پر پروفیسر صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر ان میں کوئی ایسی بات ہے جو ان کے نزدیک قابل اعتراض ہے تو وہ اُسے پیش کر دیں۔ اور اگر کوئی بات قابل اعتراض نہیں تو پھر کسی اخبار سے انتظام کر کے اپنے اعتراضات قرآن کریم کے الہامی ہونے کے متعلق شایع کرا دیں۔ پھر میں ان کا جواب شایع کرا دوں گا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؛

باہتمام شیخ عبد الرحمن صاحب قادیانی پرنٹر و پبلشر ضیاء الاسلام پریس قادیان میں [illegible] بالکان کمیٹی شایع ہوا۔